ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 0251

Program: Matric

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبہ قرآن و تفسیر

کورس :علم الاخلاق(251)

سطح :میٹرک

سمسٹر :خزاں2026 ء

امتحانی سوال نمبر 2

کل نمبر — 100 :کامیابی کے نمبر40 :

حل شدہ مشقی رہنما — مطالعہ و حوالے کے لیے

نوٹ :یہ رہنما صرف مطالعے اور سمجھنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ طلبہ سے گزارش ہے کہ اسے اپنے الفاظ میں، کتاب اور اپنے مشاہدے کی روشنی میں لکھیں؛ اسی سے اصل سیکھنے کا مقصد پورا ہوگا اور نقل سے بچا جا سکے گا۔ مذہبی امور میں قرآن و حدیث کے مفاہیم حوالے کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، لفظی اقتباسات سے گریز کیا گیا ہے، اور عملی شرعی مسائل میں مستند علماء کرام سے رجوع کی ہدایت کی گئی ہے۔

سوال نمبر1

سوال نمبر 1 ۔ آزادی رائے کی حدود متعین کریں۔ 10) نمبر(

مقدمہ

آزادی رائے انسانی وقار کا بنیادی تقاضا ہے۔ انسان سوچنے اور بولنے والا وجود ہے؛ اگر اس سے رائے کے اظہار کا حق چھین لیا جائے تو نہ علم ترقی کرتا ہے، نہ سماجی برائیوں کی نشاندہی ہوتی ہے اور نہ حکمرانوں کا احتساب ممکن رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے آئینوں اور انسانی حقوق کے عالمی اعلانات میں آزادی اظہار کو بنیادی حقوق میں شامل کیا گیا ہے۔ تاہم ہر آزادی کی طرح اس آزادی کی بھی اخلاقی اور قانونی حدود ہیں، جن کے بغیر یہی حق دوسروں کے لیے اذیت بن جاتا ہے۔

اس سوال کا مقصد انہی حدود کو متعین کرنا ہے۔ طالب علم کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ حد بندی آزادی کی دشمن نہیں بلکہ اس کی حفاظت ہے؛ جس طرح سڑک کے اصول سفر کو محدود نہیں بلکہ محفوظ بناتے ہیں، اسی طرح اظہار کی حدود رائے کو کمزور نہیں بلکہ باوقار اور موثر بناتی ہیں۔

پہلی حد :سچائی اور تحقیق

آزادی رائے کی پہلی حد یہ ہے کہ بات سچ اور تحقیق پر مبنی ہو۔ بغیر تصدیق کے خبر پھیلانا، افواہ کو آگے بڑھانا اور الزام کو حقیقت کی طرح پیش کرنا آزادی کا استعمال نہیں بلکہ اس کا غلط استعمال ہے۔ اسلامی اخلاقی تعلیمات کے مفہوم میں بھی خبر کی تحقیق پر زور دیا گیا ہے۔ صحافت، تجزیہ اور سوشل میڈیا تینوں شعبوں میں یہی حد سب سے پہلے آتی ہے، کیونکہ جھوٹی بات سے کسی کی عزت، کاروبار یا امن ایک لمحے میں تباہ ہو سکتا ہے۔ ذمہ دار شہری کا اصول یہ ہونا چاہیے کہ جو بات وہ دوسروں کے سامنے کہنے کو تیار نہیں، وہ لکھے بھی نہیں، اور جو بات تحقیق سے ثابت نہیں، اسے رائے کی صورت میں بھی احتیاط سے پیش کرے۔ یہ حد رائے کو کم نہیں کرتی بلکہ اس کی ساکھ بڑھاتی ہے۔

دوسری حد :دوسروں کی عزت اور حقوق

دوسری حد دوسروں کی عزت، نجی زندگی اور جذبات کا احترام ہے۔ آزادی رائے کا مطلب کسی کی توہین، کردار کشی، نسل یا مذہب کی بنیاد پر نفرت پھیلانا یا کسی کی ذاتی معلومات اس کی اجازت کے بغیر شائع کرنا نہیں ہے۔ تنقید کرنا ہر شہری کا حق ہے، مگر تنقید کام اور پالیسی پر ہونی چاہیے، ذات اور خاندان پر نہیں۔ اسی حد کے تحت عدالتوں میں ہتک عزت کے قوانین موجود ہیں اور مذہبی و اخلاقی تعلیمات میں غیبت اور بہتان کو سخت ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے، جس کے مفہوم سے یہی اصول نکلتا ہے۔ جو شخص اس حد کا خیال رکھتا ہے، اس کی مخالفت میں بھی وقار رہتا ہے اور اس کی بات سننے والوں پر اثر کرتی ہے، جبکہ گالی اور الزام سے بات کا وزن ختم ہو جاتا ہے۔

تیسری حد :امن عامہ اور قانون

تیسری حد ملکی قانون اور امن عامہ ہے۔ تشدد پر اکسانا، دہشت گردی کی تائید، فرقہ وارانہ نفرت پھیلانا، ریاست کے راز افشا کر کے جانوں کو خطرے میں ڈالنا اور جرم کی ترغیب دینا کسی آئین میں بھی آزادی رائے کے تحفظ میں نہیں آتا۔ اسی طرح امتحانات کے پرچے یا عدالتی کارروائی جیسے حساس معاملات میں بھی اظہار پر مخصوص پابندیاں

عالمگیر طور پر تسلیم شدہ ہیں۔ ان حدود کا مقصد رائے کو دبانا نہیں بلکہ انسانی جان و مال کی حفاظت ہے، کیونکہ آزادی وہیں ختم ہو جاتی ہے جہاں دوسرے کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔ البتہ ان قوانین کا اطلاق بھی انصاف اور شفافیت سے ہونا چاہیے تاکہ حد بندی کا بہانہ بنا کر جائز تنقید کو نہ دبایا جائے؛ یہ توازن ہی جمہوری معاشروں کی پہچان ہے۔

چوتھی حد :مقدسات اور سماجی آداب

چوتھی حد مقدسات کے احترام اور سماجی آداب سے متعلق ہے۔ تمام مذاہب کے مقدس شخصیات و علامات کی توہین سے کروڑوں لوگوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں اور معاشرے میں فساد پھیلتا ہے، اس لیے ذمہ دار آزادی کا تقاضا ہے کہ مذہبی اختلاف بھی علمی اور مہذب انداز میں بیان کیا جائے۔ اسی باب میں زبان کے آداب بھی آتے ہیں :مجلس، میڈیا اور سوشل میڈیا پر گفتگو کا انداز ایسا ہو کہ اختلاف کے باوجود دل آزاری کم سے کم ہو۔ یہ حد قانونی سے زیادہ اخلاقی ہے، اور اسی اخلاقی حد کی وجہ سے کثیر المذاہب معاشرے پرامن رہتے ہیں۔ جو قومیں اس حد کو بھول کر توہین کو آزادی سمجھ بیٹھتی ہیں، وہ سماجی تقسیم اور انتشار کی قیمت ادا کرتی ہیں۔

حدود کا تعین کس کے ذمے ہے؟

آزادی رائے کی حدود تین سطحوں پر قائم ہوتی ہیں۔ پہلی سطح فرد کا اپنا ضمیر اور تربیت ہے، جو اسے خود ہی غلط اظہار سے روکتی ہے۔ دوسری سطح پیشہ ورانہ ضابطے ہیں، مثلاً صحافت اور تدریس کے اخلاقی اصول، جن کی نگرانی متعلقہ ادارے کرتے ہیں۔ تیسری سطح ریاست کا قانون ہے، جو آخری حد کے طور پر صرف اس اظہار پر گرفت کرتا ہے جس سے جان، عزت یا امن کو حقیقی نقصان پہنچے۔ اس ترتیب کو الٹ دینا درست نہیں، یعنی ہر چھوٹی اخلاقی کوتاہی پر قانون کی گرفت مناسب نہیں اور نہ ہی قانون کی موجودگی میں ذاتی احتساب ختم ہوتا ہے۔ متوازن معاشرہ وہی ہے جہاں ضمیر، پیشہ ورانہ ضابطے اور قانون تینوں اپنی اپنی جگہ کام کریں اور شہری حدود کے اندر رہ کر بے خوف ہو کر رائے دے سکیں۔

عملی رہنمائی :حدود کی خلاف ورزی کی پہچان

روزمرہ زندگی میں اس بحث کو پرکھنے کا آسان پیمانہ یہ ہے کہ اظہار سے پہلے تین سوال پوچھے جائیں :کیا یہ بات سچ ہے؟ کیا اس سے کسی بے گناہ کی عزت یا جان کو نقصان تو نہیں پہنچے گا؟ اور کیا اسی بات کو مہذب الفاظ میں

کہا جا سکتا ہے؟ اگر تینوں سوالوں کا جواب مثبت ہو تو بات کہنا آزادی رائے کا درست استعمال ہے، اور اگر کوئی جواب منفی ہو تو خاموشی یا انداز کی تبدیلی ہی ذمہ داری ہے۔ یہ سادہ سا اصول اسکول کے طالب علم سے لے کر قومی سطح کے مقرر تک سب کے لیے کارآمد ہے اور اسی سے خود احتسابی کی عادت بنتی ہے، جس کے بغیر بیرونی قانون اکیلا ماحول درست نہیں کر سکتا۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ حدود بھی وقت اور صورتحال کے ساتھ سمجھی جاتی ہیں۔ ایمرجنسی، جنگ یا وبا جیسے حالات میں معلومات کے اظہار پر اضافی احتیاط عالمی اصول ہے، کیونکہ افواہ اس وقت جان لیوا بن سکتی ہے۔ اسی طرح بچوں کے سامنے اور تعلیمی اداروں میں اظہار کے آداب نسبتاً سخت ہوتے ہیں، کیونکہ وہاں تربیت مقصود ہوتی ہے۔ ان مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حدود کوئی جامد فہرست نہیں بلکہ اصولوں کا ایک نظام ہے، جسے عقل، قانون اور اخلاق مل کر لاگو کرتے ہیں۔ طالب علم اگر یہ نظام سمجھ لے تو وہ نہ خود غلط اظہار کرے گا اور نہ دوسروں کے غلط اظہار کا آلہ بنے گا۔

جدول :آزادی رائے کی حدود

مثال	مفہوم	حد
خبر کی تصدیق کر کے شائع کرنا	تحقیق شدہ بات کہنا	سچائی
پالیسی پر تنقید، ذات پر نہیں	توہین و کردار کشی سے پرہیز	عزت
نفرت انگیز مواد سے اجتناب	تشدد پر نہ اکسانا	امن و قانون
مہذب علمی اختلاف	مقدسات و جذبات کا احترام	آداب

مندرجہ بالا جدول سے واضح ہوتا ہے کہ موضوع کے مختلف پہلو باہم جُڑے ہوئے ہیں اور کسی ایک پہلو کو نظر انداز کرنے سے مجموعی تصویر نامکمل رہ جاتی ہے۔ طالب علم کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ ان پہلوؤں کو الگ الگ سمجھنے کے بعد ان کے باہمی تعلق پر بھی غور کرے، کیونکہ امتحانی جواب میں یہی جامعیت اچھے نمبروں کی بنیاد بنتی ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ آزادی رائے ایک قیمتی حق ہے مگر اس کی حدود سچائی و تحقیق، دوسروں کی عزت، امن عامہ و قانون، مقدسات کا احترام اور زبان کے آداب ہیں۔ یہ حدود آزادی کی راہ کی رکاوٹ نہیں بلکہ اس کی حفاظت ہیں۔ ذمہ

دار شہری وہی ہے جو حق استعمال کرتے ہوئے ان حدود کا خیال رکھے، اور ذمہ دار ریاست وہی ہے جو ان حدود کو جائز تنقید دبانے کے لیے استعمال نہ کرے۔

سوال نمبر2

سوال نمبر2 ۔ خاندانی اقدار میں کون سی چیزیں شامل ہیں؟ 10) نمبر (

مقدمہ

اقدار کسی بھی نظام کی روح ہوتی ہیں، اور خاندان چونکہ انسان کا پہلا سماجی نظام ہے، اس لیے خاندانی اقدار شخصیت سازی میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہیں۔ خاندانی اقدار سے مراد وہ اصول اور پسندیدہ رویے ہیں جنہیں ایک خاندان اور وسیع تر معاشرہ نسل در نسل اچھا سمجھ کر منتقل کرتا ہے۔ اس سوال میں ہم ان اقدار کی فہرست کو وضاحت کے ساتھ بیان کریں گے تاکہ معلوم ہو کہ ایک صحت مند خاندان کن ستونوں پر کھڑا ہوتا ہے۔

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ خاندانی اقدار محض پرانی رسموں کا نام نہیں۔ ان میں سے کچھ اقدار عالمگیر اور دائمی ہیں، جیسے سچائی اور والدین کی خدمت، جبکہ کچھ مقامی روایات سے بنتی ہیں۔ اصل اہمیت ان اقدار کی ہے جو انسان کو بہتر بناتی ہیں۔

محبت، رحمت اور ایثار

خاندانی اقدار کی فہرست میں سب سے بنیادی قدر محبت و رحمت ہے، جس کے بغیر خاندان محض ایک چھت کے نیچے رہنے والوں کا ہجوم بن جاتا ہے۔ اس سے جُڑی ہوئی قدر ایثار ہے کہ ہر فرد اپنی خواہش کو دوسروں کی ضرورت پر قربان کرنا سیکھے، خصوصاً والدین اولاد کے لیے اور بڑے چھوٹوں کے لیے یہ نمونہ پیش کریں۔ شکر گزاری بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے کہ گھر میں ایک دوسرے کے احسان کو یاد رکھا جائے اور اس کا اظہار بھی ہو۔ جن گھروں میں یہ اقدار زندہ ہوتی ہیں، وہاں کم وسائل کے باوجود سکون رہتا ہے، اور جہاں یہ ختم ہو جائیں وہاں فراوانی کے باوجود کشیدگی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفکرین خاندانی سکون کو دولت سے نہیں اقدار سے ناپتے ہیں۔

احترام، عدل اور مشاورت

دوسری بڑی اقدار میں بزرگوں کا احترام اور چھوٹوں سے شفقت شامل ہے۔ احترام کا مطلب اختلاف رائے کا خاتمہ نہیں بلکہ اختلاف کو ادب سے بیان کرنا ہے۔ تیسری قدر عدل ہے کہ اولاد، بہن بھائیوں اور دیگر اہل خانہ کے ساتھ بلا وجہ امتیاز نہ ہو اور حقوق کی تقسیم میں انصاف ہو۔ چوتھی قدر مشاورت ہے کہ گھر کے اہم فیصلے، جیسے تعلیم، شادی، رہائش اور بڑے اخراجات، سب کی رائے سن کر کیے جائیں۔ مشاورت سے فیصلے بھی بہتر ہوتے ہیں اور خاندان کے افراد کو یہ احساس بھی ملتا ہے کہ وہ نظام کا حصہ ہیں۔ ان اقدار کی موجودگی میں سربراہ کی سربراہی طاقت کے بجائے اعتماد سے قائم رہتی ہے، اور یہی قیادت گہرا ہوتی ہے۔

صدق، امانت اور پردہ پوشی

خاندانی اقدار میں سچائی اور امانت داری خاص مقام رکھتی ہیں۔ گھر کے مالی معاملات، وعدے اور بات چیت میں سچائی ہو تو اعتماد بنتا ہے، اور ایک جھوٹ پورے نظام اعتماد کو کمزور کر دیتا ہے۔ اسی طرح گھر کی باتوں اور رازوں کی حفاظت بھی ایک قدر ہے؛ اہل خانہ کی کمزوریوں کو باہر بیان کرنا خاندانی پردہ پوشی کے خلاف ہے۔ درگزر اور معافی بھی اسی فہرست میں آتے ہیں کہ غلطی پر فوراً رشتہ توڑنے کے بجائے اصلاح کا موقع دیا جائے۔ صبر و تحمل بھی ایک بڑی قدر ہے، کیونکہ روزمرہ زندگی میں اختلاف اور مشکلات آتی رہتی ہیں اور صبر ہی خاندان کو جوڑے رکھتا ہے۔ یہ اقدار مل کر خاندان کو ایک محفوظ قلعہ بناتی ہیں جہاں ہر فرد بیرونی دنیا کی تھکن کے بعد سکون پاتا ہے۔

خدمت، تعلیم اور وقت کی قدر

خاندانی اقدار میں والدین اور بزرگوں کی خدمت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، خاص طور پر ان کے بڑھاپے اور بیماری میں۔ مذہبی تعلیمات کے مفہوم میں اس خدمت کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ اس کے ساتھ علم کی قدر بھی خاندانی اقدار میں شامل ہے کہ بچوں کی تعلیم کو خرچ نہیں سرمایہ کاری سمجھا جائے، لڑکیوں سمیت سب بچوں کو برابر موقع ملے۔ وقت کی پابندی اور گھر کے نظم و ضبط، مہمان نوازی، پڑوسیوں کے حقوق کی پاسداری اور صلہ رحمی بھی معروف خاندانی اقدار ہیں۔ اسی طرح معاشی اعتدال بھی ایک قدر ہے کہ آمدن کے مطابق خرچ ہو اور دکھاوے کی دوڑ میں خاندان مقروض نہ ہو۔ یہ اقدار جب بچوں کو بچپن سے ملتی ہیں تو وہ ان کی شخصیت کا حصہ بن جاتی ہیں۔

اقدار کی حفاظت کیسے ہو؟

خاندانی اقدار کی حفاظت کے لیے زبانی نصیحت کافی نہیں، عملی نمونہ اصل ذریعہ ہے۔ بڑوں کو خود ان اقدار پر عمل کرنا ہوگا جن کی وہ توقع چھوٹوں سے رکھتے ہیں۔ دوسرا ذریعہ خاندانی روایات کو زندہ رکھنا ہے، جیسے مل کر کھانا، ہفتہ وار بیٹھک، بزرگوں کی کہانیاں اور مشترکہ خوشی غمی، کیونکہ اقدار تقریبات اور یادیوں میں منتقل ہوتی ہیں۔ تیسرا ذریعہ تعلیم اور میڈیا کا مثبت استعمال ہے کہ بچوں کو ایسی کتابیں اور پروگرام ملیں جو ان اقدار کی تائید کریں۔ چوتھا ذریعہ غلط رسوم سے اقدار کو الگ رکھنا ہے؛ جہیز کی فرسودہ رسم، فضول رسومات اور ذات پات کی تفاخر بازی اقدار نہیں بلکہ رسوم ہیں، اور صحت مند خاندان انہیں اقدار کے نام پر محفوظ نہیں رکھتا۔ یہ تفریق طالب علم کے لیے خاص طور پر اہم ہے۔

نئی نسل تک منتقلی کا چیلنج

آج خاندانی اقدار کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ انہیں اگلی نسل تک کیسے منتقل کیا جائے جو موبائل اور انٹرنیٹ کی دنیا میں پرورش پا رہی ہے۔ اس کا جواب زبردستی میں نہیں بلکہ قدر کی وجہ سمجھانے میں ہے۔ جب بچے کو بتایا جائے کہ بزرگوں کا احترام کیوں ضروری ہے، سچ بولنے سے اس کا اپنا کیا فائدہ ہے اور وقت کی پابندی اس کی کامیابی سے کیسے جڑی ہے، تو قدر اس کے دل میں اترتی ہے۔ اس کے برعکس صرف یہ کہنا کہ ہمارے ہاں ایسا ہی ہوتا ہے، نوجوان کے ذہن میں سوال پیدا کرتا ہے مگر جواب نہیں دیتا۔ اچھے خاندان روایت کو قید نہیں بناتے بلکہ اسے روشنی کی طرح آگے بڑھاتے ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض خاندانی اقدار کا اظہار وقت کے ساتھ بدلتا ہے، مگر ان کی روح باقی رہتی ہے۔ پہلے والدین کی خدمت کا مطلب ایک ہی گھر میں رہنا سمجھا جاتا تھا، آج اگر اولاد دوسرے شہر یا ملک میں ہو تو باقاعدہ رابطہ، مالی و طبی ضروریات کی خبرگیری اور عزت و توجہ اسی خدمت کی نئی صورت ہے۔ اسی طرح مشاورت پہلے بڑوں تک محدود تھی، آج نوجوانوں کی تعلیمی اور پیشہ ورانہ رائے بھی اس میں شامل ہے۔ جو خاندان روح کو برقرار رکھ کر صورت کو وقت کے مطابق ڈھال لیتا ہے، اس کی اقدار زندہ رہتی ہیں، اور جو صورت کو ہی مذہب بنا لیتا ہے، اس کی اقدار رسم بن کر بوجھ بن جاتی ہیں۔ یہ نکتہ اس سوال کا سب سے عملی سبق ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

مختصر یہ کہ خاندانی اقدار میں محبت و رحمت، ایثار، احترام، عدل، مشاورت، سچائی، امانت، پردہ پوشی، درگزر، صبر، خدمت، علم کی قدر، مہمان نوازی، صلہ رحمی اور معاشی اعتدال شامل ہیں۔ یہ اقدار خاندان کو جوڑتی ہیں اور نسل در نسل منتقل ہو کر معاشرے کو کردار عطا کرتی ہیں۔ ان کی حفاظت کا بہترین طریقہ عملی نمونہ اور محبت بھری تربیت ہے۔

سوال نمبر3

سوال نمبر3۔ آزادی فکر و رائے سے کیا مراد ہے؟ مثالوں سے وضاحت کریں۔ 10) نمبر(

مقدمہ

انسان کی تمیز اس کی سوچ ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کو دیکھتا ہے، سوال اٹھاتا ہے، نتائج اخذ کرتا ہے اور پھر اپنی رائے بناتا ہے۔ اسی سوچنے اور رائے قائم کرنے اور اسے بیان کرنے کی آزادی کو آزادی فکر و رائے کہا جاتا ہے۔ یہ حق جدید دنیا کے آئینوں کا اہم حصہ ہے اور تعلیمی و سماجی ترقی کی بنیاد بھی ہے۔ اس سوال میں ہم اس کا مفہوم واضح کر کے روزمرہ زندگی، تعلیم، صحافت اور سماجی اصلاح کی مثالوں سے اس کی وضاحت کریں گے۔

فکر اور رائے میں معمولی سا فرق بھی سمجھنا مفید ہے۔ فکر ذہن کے اندر سوچنے کا عمل ہے اور رائے اس سوچ کا نتیجہ و اظہار ہے۔ آزادی دونوں کو حاصل ہو تو ہی مکمل ہوتی ہے؛ اگر سوچ آزاد ہو مگر اظہار پر غیر معقول پابندی ہو تو فکر دم گھٹتی ہے، اور اگر اظہار موجود ہو مگر سوچ کو یک رخا پراپیگنڈے سے قابو کر لیا جائے تو وہ آزادی نام کی رہ جاتی ہے۔

مفہوم اور بنیادیں

آزادی فکر و رائے کا مطلب ہے کہ ہر انسان اپنے عقیدے، مشاہدے اور مطالعے کی بنیاد پر آزادانہ سوچے، سوال اٹھائے، کسی بات سے اتفاق یا اختلاف کرے اور اپنی بات مناسب انداز میں دوسروں تک پہنچائے، بشرطیکہ وہ دوسروں کے حقوق اور امن کو نقصان نہ پہنچائے۔ اس حق کی بنیاد انسانی وقار ہے کہ انسان کو مشین نہیں سمجھا جا سکتا۔ قرآن و سنت کے مطالعے سے بھی مفہوماً یہ اصول ملتا ہے کہ غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے اور دلیل سے بات کرنے کو پسند کیا گیا ہے، جبکہ اس کی شرعی حدود کی تفصیل علماء کرام بیان کرتے ہیں۔ انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے

میں بھی رائے رکھنے اور اظہار کرنے کی آزادی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ ان بنیادوں سے واضح ہوتا ہے کہ یہ حق کسی ایک ثقافت کی دین نہیں بلکہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔

تعلیم و تحقیق میں مثالیں

تعلیمی میدان اس آزادی کی سب سے واضح مثال ہے۔ کلاس میں طالب علم کا استاد سے سوال پوچھنا، کسی نظریے سے دلیل کے ساتھ اختلاف کرنا اور تحقیق میں پرانے نتائج کو نئے مشاہدے سے پرکھنا آزادی فکر ہی ہے۔ اگر یہ آزادی نہ ہو تو علم جامد ہو جاتا ہے اور نقل در نقل کا دور چلتا ہے۔ تاریخ علم گواہ ہے کہ طب، فلکیات اور سائنس کی بڑی پیش رفت اسی وقت ہوئیں جب مفکرین نے مسلمہ باتوں پر سوال اٹھایا۔ البتہ تعلیمی آزادی کا مطلب استاد کی توہین یا کلاس کا ماحول خراب کرنا نہیں؛ سوال ادب سے اور اختلاف دلیل سے ہوتا ہے۔ اچھا استاد اس آزادی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ سوال کرنے والا ذہن ہی آگے چل کر قوم کی رہنمائی کرتا ہے۔ طالب علم کے لیے یہ مثال سب سے قریب اور سب سے مفید ہے۔

صحافت و سماج میں مثالیں

صحافت اور سماج میں آزادی رائے کی مثال اخبار کا اداریہ، ٹی وی مباحثہ، شہری کی جانب سے مقامی مسائل پر اخبار کو خط، اور سوشل میڈیا پر کسی پالیسی پر تنقید کی صورت میں نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر کسی شہر میں پانی کی قلت پر شہریوں کا آواز اٹھانا اور انتظامیہ کو توجہ دلانا اسی حق کا استعمال ہے، جس سے اکثر مسائل حل بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح صارف کا کسی ناقص سروس کے خلاف آواز اٹھانا اور مزدور کا اپنے حقوق کے لیے پرامن احتجاج کرنا بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ یہ مثالیں بتاتی ہیں کہ آزادی رائے صرف بڑے قومی مباحث کے لیے نہیں، روزمرہ زندگی کی بہتری کا ذریعہ بھی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ بات سچ، انداز مہذب اور مقصد اصلاح ہو، جیسا کہ پچھلے سوالات میں حدود کی بحث میں بیان ہوا۔

اصلاحی و تاریخی مثالیں

تاریخ میں سماجی اصلاح کی بڑی تحریکیں آزادی فکر سے پیدا ہوئیں۔ تعلیم نسواں کی تحریک، غلامی کے خلاف آواز، اور بچوں سے مشقت کے خاتمے کی مہمات اس وقت کامیاب ہوئیں جب چند باہمت افراد نے رائج خیالات سے اختلاف کی جرات کی۔ اسلامی تاریخ میں بھی اجتہاد اور علمی اختلاف کی روایت نے فقہ و فکر کو زندہ رکھا، جس کی تفصیل

اور حدود اہل علم بیان کرتے ہیں۔ یہ مثالیں یہ سبق دیتی ہیں کہ ہر نئی اصلاح پہلے کے دور میں غیر مقبول رائے ہوتی ہے، اس لیے معاشرے کو اختلاف رائے کو برداشت کرنے کا ظرف رکھنا چاہیے۔ البتہ یہ بھی سچ ہے کہ ہر مخالفت مبنی بر حق نہیں ہوتی؛ بعض اوقات رائے کی آزادی کا غلط استعمال انتشار بھی پھیلاتا ہے، اس لیے سننے کے ساتھ پرکھنے کا شعور بھی اسی حق کا لازمی حصہ ہے۔

آزادی فکر کے ثمرات

آزادی فکر و رائے کے ثمرات وسیع ہیں۔ علمی ترقی اسی سے ہوتی ہے، سماجی برائیاں اسی سے بے نقاب ہوتی ہیں، حکمران اسی سے جواب دہ رہتے ہیں، فرد کی شخصیت اسی سے نکھرتی ہے اور معاشرے میں مکالمے کی ثقافت پیدا ہوتی ہے۔ جس معاشرے میں رائے کی آزادی محفوظ ہو، وہاں اختلاف دشمنی کے بجائے بحث میں بدل جاتا ہے، اور یہی تبدیلی پرامن ترقی کی ضمانت ہے۔ اس کے برعکس جہاں سوچ پر پہرے بٹھا دیے جائیں، وہاں خوشامد بڑھتی ہے، خامیاں چھپتی ہیں اور بالآخر بڑے بحران جنم لیتے ہیں۔ اس لیے آزادی فکر کو صرف سیاسی نعرہ نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ قوم کی اجتماعی عقل کی صحت کا نام ہے، جس کا خیال رکھنا ہر تعلیم یافتہ شہری کا فرض ہے۔

اظہار کے جدید ذرائع اور ان کا اخلاق

موجودہ دور میں آزادی رائے کی سب سے بڑی تجربہ گاہ سوشل میڈیا ہے۔ ایک عام شہری اب اپنی بات ہزاروں لوگوں تک پہنچا سکتا ہے، جو پہلے صرف اخبارات اور مقررین کو ممکن تھا۔ اس سہولت نے جہاں مظلوم کی آواز کو طاقت دی ہے، وہیں غیر ذمہ دارانہ پوسٹ، جعلی تصویر اور آدھی خبر نے نئے مسائل بھی پیدا کیے ہیں۔ اس لیے جدید آزادی رائے کی تعلیم میں ڈیجیٹل خواندگی شامل کرنا ناگزیر ہو گیا ہے :خبر کے ماخذ کی جانچ، تصویر کی تاریخ دیکھنا اور جذباتی رد عمل کے بجائے سوچ کر جواب دینا۔ جو طالب علم یہ مہارتیں سیکھ لے، وہ اس حق کا بہترین استعمال کرتا ہے۔

ساتھ ہی یہ مثال بھی قابل غور ہے کہ آزادی فکر صرف بڑے موضوعات تک محدود نہیں ہوتی۔ گھر میں بچے کا سوال کرنا، محلے کے اجلاس میں نوجوان کا تجویز دینا، دفتر میں ملازم کا بہتری کی تجویز پیش کرنا اور گاؤں کی پنچایت میں عورت کی رائے سنی جانا، یہ سب اسی آزادی کی چھوٹی مگر سچی صورتیں ہیں۔ جب نچلی سطح پر رائے کی قدر ہو تو قومی سطح پر بھی مکالمے کی ثقافت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جس ماحول میں سوال کو گستاخی سمجھا

جائے، وہاں ذہانت دب جاتی ہے اور خوشامد پروان چڑھتی ہے۔ اس لیے آزادی فکر کی حفاظت کا آغاز گھر اور کلاس سے ہوتا ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ آزادی فکر و رائے سے مراد دلیل اور مشاہدے کی بنیاد پر آزادانہ سوچنے، سوال اٹھانے اور مہذب انداز میں اظہار کرنے کا حق ہے۔ تعلیم، صحافت، سماجی اصلاح اور روزمرہ شہری زندگی میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ یہ آزادی حدود کے اندر رہ کر معاشرے کی ترقی، احتساب اور مکالمے کی بنیاد بنتی ہے، اس لیے اس کی قدر اور اس کا ذمہ دارانہ استعمال دونوں ضروری ہیں۔

سوال نمبر4

سوال نمبر4 ۔ سیاسی حقوق پر مختصر نوٹ قلمبند کریں۔ 10) نمبر(

مقدمہ

انسان صرف کھانے پینے اور رہنے کا محتاج نہیں، اسے اپنے علاقے اور ملک کے فیصلوں میں حصہ لینے کا بھی حق حاصل ہے، کیونکہ ان فیصلوں کے اثرات براہ راست اس کی زندگی پر پڑتے ہیں۔ انہی حقوق کو سیاسی حقوق کہا جاتا ہے۔ یہ حقوق شہری کو حکمرانی کے عمل میں شریک کرتے ہیں اور حکومت کو عوام کے سامنے جواب دہ بناتے ہیں۔ اس مختصر نوٹ میں ہم ان حقوق کی تعریف، اقسام، اہمیت اور حدود کا جائزہ لیں گے۔

سیاسی حقوق کا موضوع اخلاقیات سے اس لیے جُڑا ہے کہ ان کے استعمال کا بھی ایک اخلاق ہوتا ہے۔ ووٹ ایک امانت ہے، احتجاج ایک ذمہ داری ہے اور عوامی عہدہ ایک خدمت ہے۔ جب سیاسی حقوق اخلاقی شعور کے ساتھ استعمال ہوں تو نظام سنورتا ہے، ورنہ یہی حقوق انتشار کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

تعریف اور اقسام

سیاسی حقوق سے مراد وہ حقوق ہیں جن کے ذریعے شہری ریاست کے معاملات میں براہ راست یا بالواسطہ حصہ لیتا ہے۔ ان میں سب سے اہم حق رائے دہی یعنی ووٹ کا حق ہے، جس سے عوام اپنے نمائندے منتخب کرتے ہیں۔ دوسرا حق انتخابات میں امیدوار بننے کا حق ہے۔ تیسرا حق سیاسی جماعت بنانے اور اس میں شامل ہونے کا حق ہے۔ چوتھا

حق حکومت پر پرامن تنقید اور احتجاج کا حق ہے۔ پانچواں حق سرکاری عہدوں تک اہلیت کی بنیاد پر رسائی اور معلومات تک رسائی کا حق ہے۔ چھٹا حق مقامی حکومتوں میں شرکت، مثلاً یونین کونسل اور بلدیاتی اداروں میں نمائندگی ہے۔ یہ حقوق عموماً بلوغت کی عمر کے بعد حاصل ہوتے ہیں اور آئین و قانون ان کی تفصیلات متعین کرتا ہے، جیسے پاکستان کے آئین میں شہریوں کے بنیادی حقوق کی فہرست موجود ہے۔

اہمیت

سیاسی حقوق کی اہمیت اس سے واضح ہے کہ انہی کے ذریعے عوام کی مرضی حکمرانی میں شامل ہوتی ہے۔ ووٹ کی طاقت حکمران کو متنبہ رکھتی ہے کہ اسے عوام کے سامنے جواب دینا ہے، اسی جواب دہی سے بدعنوانی اور آمریت کا راستہ تنگ ہوتا ہے۔ سیاسی حقوق مظلوم طبقوں کو بھی آواز دیتے ہیں؛ خواتین، مزدور اور اقلیتوں نے انہی حقوق کے ذریعے اپنی نمائندگی اور مسائل کو ایوانوں تک پہنچایا۔ یہ حقوق شہری میں ملک سے وابستگی اور ذمہ داری کا احساس بھی پیدا کرتے ہیں، کیونکہ جس نظام میں انسان شریک ہو اس کی حفاظت بھی اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس جہاں سیاسی حقوق سلب کر لیے جائیں، وہاں بے چینی، خفیہ احتجاج اور عدم استحکام جنم لیتا ہے۔ اس لیے سیاسی حقوق کو امن کا حفاظتی نظام بھی کہا جاتا ہے۔

استعمال کی اخلاقی ذمہ داریاں

سیاسی حقوق کے ساتھ اخلاقی فرائض بھی جُڑے ہیں۔ ووٹ ذاتی تعلق، برادری یا وقتی فائدے کے بجائے اہلیت اور دیانت دیکھ کر دینا چاہیے، کیونکہ غلط نمائندے کے انتخاب کا بوجھ پورے حلقے کو اٹھانا پڑتا ہے۔ احتجاج پرامن ہونا چاہیے؛ عوامی املاک کی توڑ پھوڑ اور راستے بند کر کے مریضوں اور طلبہ کو نقصان پہنچانا حق کی نہیں طاقت کی سیاست ہے۔ جھوٹی خبریں پھیلانا، مخالف کی کردار کشی کرنا اور ووٹ خریدنا بھی ان حقوق کا غلط استعمال ہے۔ منتخب نمائندے کی اخلاقی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ عہدے کو خدمت سمجھے، وعدے پورا کرے اور عوام سے رابطہ رکھے۔ اس طرح سیاسی حقوق کا باب بھی درحقیقت اخلاقیات ہی کا باب ہے، کیونکہ نظام کاغذ پر نہیں کردار پر چلتا ہے۔

حدود اور چیلنجز

سیاسی حقوق بھی لامحدود نہیں ہوتے۔ ریاستی سلامتی، امن عامہ اور دوسروں کے حقوق ان کی حدود ہیں، جن کا ذکر آزادی رائے کی بحث میں ہو چکا۔ آج کے چیلنجوں میں انتخابی اخراجات کی بڑھتی ہوئی دوڑ، خاندانی سیاست، جعلی خبریں اور نوجوانوں کی سیاسی بے رغبتی نمایاں ہیں۔ ان چیلنجوں کا حل تعلیم اور شعور میں ہے؛ جب شہری اپنے حق کی قدر جانتا ہے تو وہ اسے بیچتا نہیں اور بہتر نمائندے منتخب کرتا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں شہری تعلیم اور مباحثوں کے فروغ سے سیاسی حقوق کا صحیح استعمال سکھایا جا سکتا ہے۔ آخر میں یہ یاد رہے کہ حقوق ہمیشہ فرائض کے ساتھ زندہ رہتے ہیں؛ جو قوم صرف حقوق مانگتی ہے اور فرائض بھول جاتی ہے، اس کے سیاسی حقوق بھی کمزور پڑ جاتے ہیں۔

بلدیاتی سطح اور خواتین و نوجوانوں کی شرکت

سیاسی حقوق کی بحث میں بلدیاتی سطح کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ عام شہری کا روزمرہ واسطہ قومی ایوانوں سے کم اور مقامی اداروں سے زیادہ پڑتا ہے۔ گلی، پانی، صفائی اور اسکول جیسے مسائل مقامی نمائندوں سے جڑے ہوتے ہیں، اس لیے گاؤں اور محلے کی سطح پر ووٹ اور نمائندگی کا حق درحقیقت سیاسی حقوق کی سب سے قریبی صورت ہے۔ طالب علم کے لیے یہ سمجھنا مفید ہے کہ جمہوریت کی بنیاد نچلی سطح سے مضبوط ہوتی ہے، اور جو نظام مقامی سطح پر شہری کو شریک نہیں کرتا، وہ اوپر کی سطح پر بھی نمائشی رہ جاتا ہے۔

اسی باب میں خواتین اور نوجوانوں کی سیاسی شرکت کا ذکر بھی ضروری ہے۔ خواتین کے لیے مخصوص نشستیں اور ووٹ کے حق کی آگاہی اس سمت قدم ہیں، مگر اصل تبدیلی تب آئے گی جب گھروں میں بیٹیوں کو بھی رائے کی قدر سکھائی جائے اور ان کے ووٹ کو ان کی اپنی پسند سمجھا جائے۔ نوجوان آبادی کا بڑا حصہ ہیں؛ اگر وہ سیاست سے لاتعلق رہیں تو فیصلے ان کے بغیر ہوتے رہیں گے۔ تعلیمی اداروں میں طلبہ تنظیموں کے پرامن مباحثے، فرضی انتخابات اور شہری تعلیم کے پروگرام نوجوانوں کو اس حق کا شعور دیتے ہیں۔ ان اضافوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی حقوق کوئی جامد فہرست نہیں بلکہ ایک زندہ عمل ہے جو شرکت سے مضبوط ہوتا ہے۔

جدول :سیاسی حقوق کی اقسام

مفہوم	سیاسی حق
نمائندے کا انتخاب	ووٹ کا حق

خود انتخاب لڑنا	امیدواری
پرامن اظہار اختلاف	تنقید و احتجاج
سیاسی تنظیم بنانا یا شامل ہونا	جماعت سازی

مندرجہ بالا جدول سے واضح ہوتا ہے کہ موضوع کے مختلف پہلو باہم جُڑے ہوئے ہیں اور کسی ایک پہلو کو نظر انداز کرنے سے مجموعی تصویر نامکمل رہ جاتی ہے۔ طالب علم کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ ان پہلوؤں کو الگ الگ سمجھنے کے بعد ان کے باہمی تعلق پر بھی غور کرے، کیونکہ امتحانی جواب میں یہی جامعیت اچھے نمبروں کی بنیاد بنتی ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

مختصر یہ کہ سیاسی حقوق شہری کی حکمرانی میں شرکت کے حقوق ہیں جن میں ووٹ، امیدواری، جماعت سازی، تنقید و احتجاج اور عوامی عہدے تک رسائی شامل ہیں۔ یہ حقوق حکومت کو جواب دہ اور شہری کو ذمہ دار بناتے ہیں۔ ان کا اخلاقی اور باشعور استعمال ہی جمہوری نظام کی کامیابی کی ضمانت ہے، اس لیے ہر شہری کو ان کی قدر اور ان کے استعمال کا سلیقہ دونوں سیکھنا چاہیے۔

سوال نمبر5

سوال نمبر5 ۔ رواداری پر مختصر نوٹ لکھیں۔ 10) نمبر(

مقدمہ

انسانوں کے درمیان اختلاف فطری ہے۔ زبان، مذہب، نسل، ذوق اور سوچ میں فرق زندگی کا حسن بھی ہے اور آزمائش بھی۔ اس فرق کے ساتھ پرامن رہنے کی صلاحیت کو رواداری کہا جاتا ہے۔ اگر رواداری نہ ہو تو ہر اختلاف لڑائی میں بدل جائے اور معاشرہ نفرت اور تقسیم کا شکار ہو جائے۔ اس مختصر نوٹ میں ہم رواداری کا مفہوم، اس کی اقسام، فوائد اور اسے اپنانے کے طریقے بیان کریں گے۔

رواداری کو کمزوری سمجھنا ایک بڑی غلط فہمی ہے۔ روادار انسان اپنے اصولوں سے دستبردار نہیں ہوتا، وہ صرف یہ تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے کو بھی اپنے عقیدے اور رائے کے ساتھ جینے کا حق ہے۔ یہی ظرف بڑے دلوں اور مہذب معاشروں کی پہچان ہے۔

مفہوم اور حدود

رواداری سے مراد دوسروں کے عقائد، آراء، رسوم اور طرز زندگی سے اختلاف کے باوجود ان کے انسانی وقار کا احترام کرنا، ان کے ساتھ پرامن رہنا اور ان پر زبردستی نہ کرنا ہے۔ اس میں سننے کا حوصلہ، اختلاف کو دشمنی نہ بنانا اور اپنے حق پر قائم رہتے ہوئے دوسرے کے حق کو تسلیم کرنا شامل ہے۔ رواداری کی حد یہ ہے کہ ظلم، جرم اور دوسروں کے حقوق کی پامالی کو برداشت کرنا رواداری نہیں؛ رواداری عقیدے و رائے کے اختلاف میں ہے، انسانی حقوق کی خلاف ورزی میں نہیں۔ یہی توازن اصل رواداری ہے، ورنہ ایک طرف تعصب اور دوسری طرف لا تعلقی دونوں نقصان دہ ہیں۔ اسلامی تعلیمات کے مفہوم میں بھی مختلف عقائد کے لوگوں کے ساتھ انصاف اور حسن سلوک کی تلقین ملتی ہے، جبکہ اس کی عملی شرعی تفصیلات کا مرجع علماء کرام ہیں۔

رواداری کی صورتیں

رواداری کی کئی صورتیں ہیں۔ مذہبی رواداری یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے افراد ایک دوسرے کی عبادت گاہوں اور مقدسات کا احترام کریں اور اختلاف کو علمی مکالمے تک رکھیں؛ پاکستان جیسے کثیر المذہب معاشرے میں اس کی خاص اہمیت ہے۔ سماجی رواداری یہ ہے کہ زبان، لباس اور علاقائی رسوم کے فرق پر مذاق نہ اڑایا جائے۔ سیاسی رواداری یہ ہے کہ مخالف جماعت کے کارکن کو دشمن نہیں بلکہ اختلاف رائے رکھنے والا شہری سمجھا جائے۔ خاندانی رواداری یہ ہے کہ نسل، ذوق اور فیصلوں کے اختلاف کو احترام سے نمٹا جائے۔ تعلیمی رواداری یہ ہے کہ کلاس میں ہر طالب علم کو سوال اور اظہار کا موقع ملے۔ یہ صورتیں بتاتی ہیں کہ رواداری کوئی دور کی چیز نہیں، گھر سے پارلیمنٹ تک ہر جگہ اس کی ضرورت ہے۔

فوائد

رواداری کے فوائد فوری بھی ہیں اور دور رس بھی۔ اس سے معاشرے میں امن قائم رہتا ہے، اقلیتوں اور کمزور طبقات کو تحفظ ملتا ہے، اور لوگ اپنی صلاحیتیں خوف کے بغیر استعمال کرتے ہیں۔ علمی میدان میں رواداری سے مباحثہ زندہ رہتا ہے اور سچائی تک پہنچنا آسان ہوتا ہے۔ معاشی طور پر پرامن اور روادار شہر تجارت اور سیاحت کے مرکز بنتے ہیں، جبکہ متعصب ماحول سے اہل ہنر اور سرمایہ دور ہو جاتا ہے۔ نفسیاتی طور پر روادار انسان خود بھی سکون میں رہتا ہے، کیونکہ نفرت پالنے والا سب سے پہلے اپنے دل کا سکون کھوتا ہے۔ سب سے بڑا فائدہ قومی اتحاد ہے؛

جب مختلف گروہ ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہیں تو ملک بیرونی بحرانوں میں بھی متحد رہتا ہے۔ اس لیے رواداری کو قومی طاقت کا خاموش ستون کہا جاتا ہے۔

رواداری کیسے پیدا ہو؟

رواداری کتابوں سے زیادہ تربیت اور تجربے سے پیدا ہوتی ہے۔ بچوں کو شروع سے سکھایا جائے کہ اختلاف کا جواب دلیل سے دیا جاتا ہے، گالی سے نہیں۔ مختلف عقیدوں اور مذاہب کے لوگوں کی تاریخ و ثقافت کو نصاب میں مناسب جگہ ملے تاکہ اجنبیت ختم ہو۔ میڈیا اور سوشل میڈیا پر نفرت انگیز مواد کی حوصلہ شکنی اور مکالمے کے پروگراموں کی حوصلہ افزائی بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ فرد کی سطح پر سننے کی عادت، جلد بازی میں رائے نہ بنانا اور اپنے مخالف کی بات کو انصاف سے سمجھنا رواداری پیدا کرتا ہے۔ یاد رہے کہ رواداری کا آغاز ہمیشہ اپنی ذات سے ہوتا ہے؛ جو شخص اپنے گھر اور محلے میں اختلاف برداشت نہیں کر سکتا، وہ بڑے پلیٹ فارم پر بھی متعصب ہی رہے گا۔

رواداری کی تعلیمی و نفسیاتی بنیاد

نفسیاتی طور پر رواداری کا تعلق اپنے عقیدے میں اعتماد سے ہے۔ جو شخص اپنے موقف کی دلیل جانتا ہے، وہ مخالف کی بات سن کر گھبراتا نہیں، جبکہ جس کا عقیدہ محض تقلید اور خوف پر کھڑا ہو، وہ ہر اختلاف کو خطرہ سمجھتا ہے۔ اسی لیے رواداری کی تربیت میں اپنے دین و نظریے کا صحیح علم بھی شامل ہے؛ علم اعتماد دیتا ہے اور اعتماد رواداری پیدا کرتا ہے۔ تعلیمی اداروں میں مختلف نظریات کو انصاف سے پڑھانا، سوال کی حوصلہ افزائی اور استاد کا خود روادار ہونا طلبہ کے مزاج کو بدل دیتا ہے۔ یہ نکتہ والدین کے لیے بھی ہے کہ بچے کے سوال کو دبانے کے بجائے اس کا مناسب جواب دیا جائے تو بچہ بڑا ہو کر دوسروں کے سوالوں کو بھی برداشت کرنا سیکھتا ہے۔

رواداری کا ایک عملی امتحان روزمرہ کے چھوٹے معاملات میں ہوتا ہے :قطار میں دوسرے کا حق تسلیم کرنا، ٹریفک میں دوسری گاڑی کو راستہ دینا، دفتر میں ساتھی کے مذہبی تہوار کا احترام کرنا اور محلے میں دوسرے مسلک یا مذہب کی خوشی غمی میں شریک ہونا۔ یہ چھوٹی صورتیں اس بات کی علامت ہیں کہ رواداری دل میں اتر چکی ہے۔ بڑی تقریروں میں رواداری کا دعویٰ آسان ہے، مگر اصل قدر روزمرہ کے رویے سے ناپی جاتی ہے۔ اسی لیے اس نوٹ کا

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

حاصل یہ ہے کہ رواداری کو اصول کے ساتھ ساتھ عادت بنایا جائے، کیونکہ عادت بن جائے تو اس پر عمل مشکل نہیں رہتا۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ رواداری اختلاف کے ساتھ پرامن اور باعزت زندگی گزارنے کا نام ہے۔ اس کی صورتیں مذہبی، سماجی، سیاسی اور خاندانی زندگی میں پائی جاتی ہیں اور اس کے ثمرات امن، اتحاد اور ترقی ہیں۔ رواداری اپنے اصول چھوڑنا نہیں بلکہ دوسرے کے انسانی وقار کو تسلیم کرنا ہے، اور یہی وہ قدر ہے جو متنوع معاشروں کو متحد رکھتی ہے۔

ایک اور پہلو یہ ہے کہ رواداری کا سب سے پہلا امتحان زبان ہے۔ اختلاف کے وقت طنز، القابات اور چیخنے سے ماحول وہیں بگڑ جاتا ہے جہاں سے گفتگو شروع ہوتی ہے، جبکہ پرسکون آواز اور دلیل سے کہی گئی سخت بات بھی قبول ہو سکتی ہے۔ مدارس، مساجد اور میڈیا اگر اس لہجے کی تربیت کریں تو معاشرے میں رواداری تقریر کے موضوع سے نکل کر مزاج بن جائے گی۔ اسی طرح خاندان کے بڑوں کو یہ بھی دکھانا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہم خیال اور مختلف الخیال رشتہ دار دونوں کے ساتھ یکساں ادب رکھتے ہیں، کیونکہ بچے تقریر سے نہیں، مشاہدے سے روادار بنتے ہیں۔

سوال نمبر6

سوال نمبر6 ۔ خودداری پر مختصر نوٹ لکھیں۔ 10) نمبر(

مقدمہ

انسان کی سب سے قیمتی دولت اس کی عزت نفس ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو خود ہی ذلیل کر لے، دنیا بھی اس کی قدر نہیں کرتی، اور جو اپنی عزت کا پاس رکھے، حالات کی سختی بھی اس کے وقار کو ختم نہیں کر سکتی۔ اسی عزت نفس اور خود انحصاری کے جذبے کو خودداری کہا جاتا ہے۔ اس مختصر نوٹ میں ہم خودداری کا مفہوم، اس کی صورتیں، تکبر سے اس کا فرق اور اس کے فوائد بیان کریں گے۔

خودداری کا موضوع اس دور میں خاص اہمیت رکھتا ہے جب دکھاوا، قرض لے کر نمود کرنا اور دوسروں کے سہارے آگے بڑھنے کی دوڑ عام ہو رہی ہے۔ خوددار انسان سادہ زندگی گزارنا پسند کرتا ہے مگر کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے اور ضمیر کا سودا کرنے کو گوارا نہیں کرتا۔

مفہوم

خودداری سے مراد اپنی عزت نفس کی حفاظت کرتے ہوئے محنت اور جائز ذرائع سے زندگی گزارنا، بلا ضرورت کسی کے آگے سوال نہ کرنا، احسان کا بدلہ یاد رکھنا مگر خود کو کسی کا غلام نہ بنانا اور مشکل حالات میں بھی اپنے اصولوں پر قائم رہنا ہے۔ خوددار شخص دست سوال دراز کرنے کے بجائے چھوٹی مگر حلال آمدن کو ترجیح دیتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مفہوم میں بھی اوپر والے ہاتھ کو نیچے والے ہاتھ سے بہتر قرار دینے اور کسب حلال کی ترغیب سے یہی سبق ملتا ہے کہ سوال سے بچنا اور محنت پر بھروسا کرنا پسندیدہ روش ہے۔ خودداری میں یہ بھی شامل ہے کہ انسان اپنی کمزوریوں کی نمائش کر کے ہمدردی نہ بٹورے اور اپنی کامیابی کا کریڈٹ غرور کے بجائے ذمہ داری سے لے۔

خودداری اور تکبر میں فرق

خودداری اور تکبر میں زمین آسمان کا فرق ہے، اگرچہ ظاہر میں دونوں میں سر اونچا نظر آتا ہے۔ خوددار شخص خود کو بڑا نہیں سمجھتا، وہ صرف خود کو چھوٹا کرنے پر تیار نہیں ہوتا؛ وہ دوسروں کی عزت کرتا ہے، مدد لیتا ہے تو شکر گزار ہوتا ہے اور مدد دیتا ہے تو احسان نہیں جتاتا۔ اس کے برعکس متکبر دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے، ان کی مدد کو اپنا حق سمجھتا ہے اور کمزور کو دبانے میں لطف لیتا ہے۔ خودداری میں انکسار کے ساتھ وقار ہوتا ہے، جبکہ تکبر میں وقار کے پردے میں حقارت ہوتی ہے۔ اس فرق کو سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ بعض اوقات خودداری کو غرور کہہ کر نوجوانوں کو سوال اور چاپلوسی کی طرف دھکیلا جاتا ہے، حالانکہ اصل دانائی میانہ روی ہے: نہ جھک کر ذلت، نہ اکڑ کر تکبر۔

خودداری کی صورتیں اور مثالیں

خودداری کی صورتیں روزمرہ زندگی میں عام ہیں۔ طالب علم کا نقل سے انکار اور محنت سے پاس ہونا خودداری ہے۔ مزدور کا کم اجرت مگر حلال کام کو رشوت اور چوری پر ترجیح دینا خودداری ہے۔ نوجوان کا شادی اور ضروریات

میں اپنے والدین پر غیر ضروری بوجھ نہ ڈالنا اور اپنی استطاعت کے مطابق سادگی اپنانا خودداری ہے۔ قرض لینا ناجائز نہیں، مگر قرض لے کر نمود و نمائش کرنا اور واپسی میں ٹال مٹول کرنا خودداری کے خلاف ہے۔ تاریخ اور ادب میں بھی خوددار کرداروں کو ہمیشہ عزت ملی ہے؛ شاعر مشرق نے خودی کے فلسفے میں بھی اسی جذبے کو اجاگر کیا ہے کہ انسان اپنی قدر خود پہچانے۔ یہ مثالیں بتاتی ہیں کہ خودداری کسی ایک طبقے کی جاگیر نہیں، ہر عمر اور ہر پیشے میں اس کی گنجائش موجود ہے۔

فوائد اور تربیت

خودداری کے فوائد فرد اور معاشرے دونوں کے لیے ہیں۔ فرد کو یہ ذہنی آزادی دیتی ہے، کیونکہ جو کسی کے احسان تلے نہیں وہ سچ بات کہنے کی جرات رکھتا ہے۔ یہ انسان کو محنت کی عادت دیتی ہے، جس سے صلاحیت بڑھتی ہے اور قسمت بھی ساتھ دیتی ہے۔ معاشرے میں خوددار لوگوں کی موجودگی سے بھیک، سفارش اور مفاد پرستی کم ہوتی ہے اور میرٹ کی قدر بڑھتی ہے۔ خودداری کی تربیت بچپن سے ہوتی ہے؛ بچے کو اپنی چیز خود سنبھالنا، اپنی غلطی کا نتیجہ قبول کرنا اور اپنی جیب خرچ میں منصوبہ بندی سکھانا اسی کے مراحل ہیں۔ بڑوں کے لیے اصول یہ ہے کہ ضرورت کے وقت جائز مدد لینا خودداری کے خلاف نہیں، خلاف یہ ہے کہ مدد کو عادت اور حق بنا لیا جائے۔ متوازن خودداری انسان کو باوقار، خود اعتماد اور قابل بھروسا بنا دیتی ہے۔

خودداری اور معاشی زندگی

خودداری کا گہرا تعلق معاشی زندگی سے بھی ہے۔ خوددار انسان اپنی آمدن کے اندر رہنا سیکھتا ہے، اس لیے وہ قرض کی نمود، دکھاوے کی شادیوں اور برانڈ کی دوڑ سے بچتا ہے۔ یہ عادت اسے معاشی بحران میں بھی پرسکون رکھتی ہے، کیونکہ اس کی ضروریات محدود اور اس کے اخراجات قابو میں ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جو شخص دوسروں کی دیکھا دیکھی زندگی گزارتا ہے، وہ جلد قرض اور پریشانی میں گھر جاتا ہے اور پھر اس کی خودداری بھی متاثر ہوتی ہے، کیونکہ مقروض آدمی اکثر سچ کہنے اور انکار کرنے کی آزادی کھو بیٹھتا ہے۔ اس لیے مالی نظم و ضبط کو خودداری کی عملی بنیاد سمجھنا چاہیے اور نوجوانوں کو یہ ہنر تعلیم کے ساتھ سکھانا چاہیے۔

خودداری کی ایک اور صورت پیشہ ورانہ زندگی میں ہے۔ وہ ملازم یا افسر جو ترقی کے لیے چاپلوسی اور سفارش کے بجائے اپنی کارکردگی پر بھروسا کرتا ہے، اس کی عزت دیرپا ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ تاجر جو ناجائز منافع کے بجائے

ساکھ کو ترجیح دیتا ہے، مشکل وقت میں بھی گاہکوں کا اعتماد قائم رکھتا ہے۔ ان مثالوں میں خودداری انکار کا نام نہیں بلکہ ایک مثبت حکمت عملی ہے جو آہستہ آہستہ انسان کو اس مقام پر لے جاتی ہے جہاں اسے کسی کے آگے جھکنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہی اس مختصر نوٹ کا مرکزی پیغام ہے کہ خودداری فطرت سے نہیں، روز کے چھوٹے فیصلوں سے بنتی ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

مختصر یہ کہ خودداری عزت نفس کی حفاظت، محنت پر بھروسا اور اصولوں پر استقامت کا نام ہے۔ یہ تکبر سے مختلف ہے، کیونکہ اس میں دوسروں کی عزت اور شکر گزاری شامل ہے۔ خوددار انسان مشکل میں بھی سر اٹھا کر جیتا ہے اور معاشرے کے لیے میرٹ اور اعتماد کا ماحول پیدا کرتا ہے۔ اس لیے اس قدر کو تعلیم و تربیت میں خاص جگہ ملنی چاہیے۔

سوال نمبر7

سوال نمبر7 ۔ فرد کے لیے حقوق کی وضاحت کریں۔ 10) نمبر(

مقدمہ

ہر انسان محض انسان ہونے کی وجہ سے کچھ حقوق رکھتا ہے، جو اسے کسی حکمران کی بخشش سے نہیں بلکہ اس کی انسانی حیثیت سے حاصل ہوتے ہیں۔ فرد کے حقوق کا موضوع اخلاقیات، قانون اور سیاست تینوں سے جُڑا ہے۔ اس سوال میں ہم ان حقوق کی تعریف، ان کی اہم اقسام اور ان کی حفاظت کے ذرائع کی وضاحت کریں گے، اور یہ بھی دیکھیں گے کہ یہ حقوق اخلاقی بنیادوں پر کیسے کھڑے ہیں۔

حقوق کی بحث کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ یہ کسی خاص طبقے یا مذہب کے لیے مخصوص نہیں ہوتے۔ امیر و غریب، مرد و عورت، اکثریت و اقلیت سب کے بنیادی حقوق برابر ہیں، اور اسی برابری میں انسانی وقار کا راز چھپا ہے۔

تعریف اور بنیاد

فرد کے حقوق سے مراد وہ جائز اختیارات اور تحفظات ہیں جو ہر انسان کو عزت دار زندگی گزارنے کے لیے حاصل ہوتے ہیں اور جنہیں ریاست و معاشرہ تسلیم کرتا ہے۔ ان کی بنیاد دو چیزوں پر ہے :انسانی فطرت و وقار، اور مذہبی و

قانونی ماخذ۔ اسلامی فہم کے مطابق انسان کو خالق کی طرف سے عزت و تکریم عطا ہوئی ہے، جس کا مفہوم قرآن کی تعلیمات میں بیان کیا جاتا ہے اور اسی سے جان، مال اور عزت کے تحفظ کا اصول نکلتا ہے؛ اس کی شرعی تفصیل علماء کا دائرہ ہے۔ جدید دنیا میں انہی حقوق کو آئین اور انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے میں درج کیا گیا ہے۔ اس لیے فرد کے حقوق کوئی نئی درآمدی سوچ نہیں بلکہ انسانی تاریخ کی مشترکہ اخلاقی میراث ہیں، جن کی حفاظت ہر مہذب معاشرے کی علامت ہے۔

بنیادی حقوق کی اقسام

فرد کے حقوق میں سب سے پہلا حق زندگی اور جان کے تحفظ کا حق ہے۔ دوسرا حق عزت و ناموس کے تحفظ کا ہے کہ کسی کی بے عزتی، کردار کشی یا نجی زندگی میں مداخلت نہ ہو۔ تیسرا حق آزادی و نقل و حرکت کا ہے، قانون کی حدود کے اندر۔ چوتھا حق تعلیم کا ہے، کیونکہ تعلیم کے بغیر باقی حقوق کا شعور بھی نہیں آتا۔ پانچواں حق کما کر جائز ملکیت رکھنے اور اس کے تحفظ کا ہے۔ چھٹا حق انصاف تک رسائی کا ہے کہ ہر شخص عدالت میں اپنی بات کہہ سکے اور اسے صفائی کا موقع ملے۔ ساتواں حق مذہبی آزادی اور ضمیر کی آزادی کا ہے۔ آٹھواں حق صحت و علاج اور بنیادی ضروریات کی فراہمی میں ریاست و معاشرے کی ذمہ داری سے جڑا ہے۔ یہ فہرست بتاتی ہے کہ حقوق کا دائرہ جان سے لے کر ضمیر تک وسیع ہے۔

حقوق اور اخلاقیات کا تعلق

فرد کے حقوق کی حفاظت صرف قانون سے نہیں ہوتی، اخلاقی شعور سے بھی ہوتی ہے۔ قانون اس وقت حرکت میں آتا ہے جب خلاف ورزی ہو جائے، جبکہ اخلاق خلاف ورزی ہونے ہی نہیں دیتا۔ جو استاد شاگرد کے حق کو اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہے، وہ کلاس میں انصاف کرتا ہے؛ جو تاجر صارف کے حق کو مانتا ہے، وہ دھوکا نہیں کرتا؛ اور جو افسر شہری کے حق کو تسلیم کرتا ہے، وہ رشوت نہیں لیتا۔ اسی لیے اخلاقیات کے نصاب میں حقوق کی تعلیم دی جاتی ہے تاکہ شہری بھی اپنے حقوق جانیں اور دوسروں کے حقوق کے محافظ بھی بنیں۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ حقوق کے ساتھ استعمال کی ذمہ داری آتی ہے؛ اپنے حق کے نام پر دوسرے کے حق کو پامال کرنا حقوق نہیں بلکہ انارکی ہے۔

تحفظ کے ذرائع اور چیلنجز

فرد کے حقوق کے تحفظ کے ذرائع میں آئین و قانون، آزاد عدلیہ، میڈیا، انسانی حقوق کی تنظیمیں اور سب سے بڑھ کر باشعور عوام شامل ہیں۔ اگر شہری اپنے حقوق سے واقف نہ ہو تو بہترین قانون بھی کاغذ پر رہ جاتا ہے۔ دور حاضر کے چیلنجوں میں معلومات کی کمی، غربت، مقدمات کی طوالت اور طاقتور کے مقابلے میں کمزور کی کمزور آواز شامل ہیں۔ ان کا حل قانونی امداد کی سہولت، حقوق کی تعلیم کو نصاب میں شامل کرنا اور شکایت کے نظام کو سادہ بنانا ہے۔ خواتین، بچوں، مزدوروں اور اقلیتوں کے حقوق پر خاص توجہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ عملی زندگی میں یہی طبقات سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ آخر میں یہ اصول یاد رکھنا چاہیے کہ حقوق مانگنے کے ساتھ دینے کی ثقافت بھی ہو، تب ہی حقوق کا نظام زندہ رہتا ہے۔

حقوق کی تاریخ و ارتقاء ایک نظر میں

فرد کے حقوق کا تصور انسانی تاریخ میں آہستہ آہستہ وسیع ہوا ہے۔ قدیم زمانے میں حقوق عموماً بادشاہوں اور اشرافیہ تک محدود تھے، عام انسان کی جان و مال کا تحفظ کمزور تھا۔ مذاہب اور اصلاحی تحریکوں نے انسان کی حرمت کا تصور مضبوط کیا، اور جدید دور میں آئینوں اور عالمی اعلامیوں نے ان حقوق کو تحریری ضمانت دی۔ اسلامی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جان، مال، عزت اور مذہبی آزادی کے تحفظ کے اصول بہت پہلے بیان کیے گئے تھے، جن کا مفہوم اہل علم نے تفصیل سے لکھا ہے اور جن کی عملی حدود کی بحث علماء کا دائرہ ہے۔ اس تاریخی نظر سے طالب علم کو یہ اعتماد حاصل ہوتا ہے کہ حقوق کوئی عارضی فیشن نہیں بلکہ انسانیت کی لمبی جدوجہد کا نتیجہ ہیں۔

ساتھ ہی یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ حقوق کی فہرست وقت کے ساتھ بڑھتی رہی ہے۔ ماحول کا حق، معلومات تک رسائی، ڈیجیٹل نجی زندگی کا تحفظ اور معذور افراد کے خاص حقوق آج کی بحث کا حصہ ہیں۔ ان اضافوں سے اصل اصول نہیں بدلا، صرف اس کا اطلاق نئے حالات پر ہوا ہے۔ اس لیے طالب علم کو حقوق کو جامد فہرست کے بجائے زندہ نظام سمجھنا چاہیے، جس میں ہر نسل اپنے دور کے مسائل کے مطابق اضافہ کرتی ہے۔ تاہم ہر نئے مطالبے کو حق قرار دینے سے پہلے اسے انسانی وقار اور دوسروں کے حقوق کے پیمانے پر پرکھنا بھی اسی شعور کا حصہ ہے۔

جدول :فرد کے اہم حقوق

حق	وضاحت

زندگی اور سلامتی کا حق	جان کا تحفظ
ناموس و نجی زندگی کا تحفظ	عزت
علم حاصل کرنے کا موقع	تعلیم
عدالت تک رسائی اور سماعت	انصاف
جائز کمائی و جائیداد کا تحفظ	ملکیت

مندرجہ بالا جدول سے واضح ہوتا ہے کہ موضوع کے مختلف پہلو باہم جُڑے ہوئے ہیں اور کسی ایک پہلو کو نظر انداز کرنے سے مجموعی تصویر نامکمل رہ جاتی ہے۔ طالب علم کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ ان پہلوؤں کو الگ الگ سمجھنے کے بعد ان کے باہمی تعلق پر بھی غور کرے، کیونکہ امتحانی جواب میں یہی جامعیت اچھے نمبروں کی بنیاد بنتی ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ فرد کے لیے حقوق میں جان، عزت، آزادی، تعلیم، ملکیت، انصاف، مذہبی آزادی اور صحت و بنیادی ضروریات کے حقوق شامل ہیں۔ ان کی بنیاد انسانی وقار ہے اور ان کی حفاظت قانون کے ساتھ ساتھ اخلاقی شعور سے ہوتی ہے۔ باشعور شہری وہی ہے جو اپنے حقوق پہچانے اور دوسروں کے حقوق کا محافظ بھی بنے۔

سوال نمبر 8

سوال نمبر 8 ۔ فرد کے فرائض کی وضاحت کریں۔ (نمبر 10)

مقدمہ

حقوق اور فرائض ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ جہاں معاشرہ فرد کو حقوق دیتا ہے، وہیں فرد سے کچھ فرائض کی توقع بھی رکھتا ہے، کیونکہ اگر ہر شخص صرف لینے کی بات کرے اور دینے سے انکار کر دے تو نظام ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔ اس سوال میں ہم فرد کے فرائض کی تعریف، ان کی اقسام اور ان کی ادائیگی کی اہمیت واضح کریں گے۔

فرائض کی بحث اخلاقیات کے قلب میں ہے، کیونکہ اخلاق درحقیقت فرائض ہی کا شعور ہے :اپنے ساتھ، خاندان کے ساتھ، معاشرے کے ساتھ اور خالق کے ساتھ درست رویہ اختیار کرنا۔ اسی ترتیب سے ہم فرائض کو بیان کریں گے۔

تعریف اور بنیادی تصور

فرد کے فرائض سے مراد وہ ذمہ داریاں اور ذمے کے کام ہیں جو انسان پر اپنی ذات، خاندان، معاشرے، ریاست اور مذہبی نقطہ نظر سے اپنے خالق کے حوالے سے عائد ہوتے ہیں۔ فرض حق کا آئینہ ہوتا ہے؛ جہاں ایک شخص کا حق ہے، وہیں دوسرے کا فرض بنتا ہے کہ وہ اس حق کو تسلیم کرے۔ فرائض کی دو قسمیں ہیں :قانونی فرائض، جن کی خلاف ورزی پر سزا ملتی ہے، جیسے ٹیکس دینا اور قانون کی پابندی، اور اخلاقی فرائض، جن کی نگرانی ضمیر اور معاشرہ کرتا ہے، جیسے والدین کی خدمت، پڑوسی کی مدد اور سچ بولنا۔ پختہ شہری دونوں قسم کے فرائض کو یکساں اہمیت دیتا ہے، کیونکہ صرف سزا کے خوف سے جینا کم تر درجے کی شہریت ہے اور ضمیر کی آواز پر چلنا اعلیٰ درجے کی۔

شخصی اور خاندانی فرائض

فرد کے پہلے فرائض اپنی ذات کے بارے میں ہیں :صحت کی حفاظت، تعلیم حاصل کرنا، کردار سنوارنا اور وقت کی قدر کرنا، کیونکہ جو اپنے آپ کا حق ادا نہیں کرتا وہ دوسروں کے فرائض بھی پورے نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد خاندانی فرائض آتے ہیں :والدین کی عزت و خدمت، اولاد کی تعلیم و تربیت، شریکِ حیات کے حقوق کی ادائیگی، بہن بھائیوں سے حسن سلوک اور رشتہ داروں سے صلہ رحمی۔ یہ فرائض قانون کے بجائے محبت سے ادا ہوتے ہیں، اس لیے ان کی قیمت بھی زیادہ ہے۔ مثال کے طور پر بیمار والدین کی تیمارداری کو کوئی عدالت نہیں ناپ سکتی، مگر یہی فرض انسان کی انسانیت کا اصل امتحان ہے۔ خاندانی فرائض کی ادائیگی سے ہی وہ محفوظ ماحول بنتا ہے جس میں اگلی نسل پروان چڑھتی ہے۔

معاشرتی اور قومی فرائض

معاشرتی فرائض میں پڑوسیوں کے حقوق کا خیال، کمزور کی مدد، عوامی جگہوں کی صفائی، دوسروں کے مال و عزت کی حفاظت اور سماجی برائیوں کے خلاف پرامن کردار ادا کرنا شامل ہے۔ قومی فرائض میں قانون کی پابندی، ٹیکس کی ایماندارانہ ادائیگی، ووٹ کا ذمہ دارانہ استعمال، ملک کی املاک کی حفاظت اور بحران میں قوم کا ساتھ دینا شامل ہیں۔ ملازمت کے فرائض بھی اسی سلسلے میں آتے ہیں کہ جس ادارے سے روزی ملتی ہے اس کے ساتھ وفاداری اور کام میں دیانت برتی جائے۔ یہ فرائض بظاہر بوجھ لگتے ہیں، مگر درحقیقت یہ اس نظام کی قیمت ہے جس سے خود

فرد کو حقوق اور تحفظ ملتا ہے۔ جو شہری ٹیکس چوری کر کے بھی بہترین سہولتوں کا مطالبہ کرے، وہ حقوق اور فرائض کا توازن بھول رہا ہے۔

فرائض کی ادائیگی کے فوائد اور غفلت کے نقصانات

فرائض کی ادائیگی سے فرد کو عزت اور ضمیر کی اطمینان ملتی ہے، خاندان کو سکون ملتا ہے، معاشرے کو اعتماد ملتا ہے اور ریاست کو استحکام ملتا ہے۔ فرائض شناس لوگ کسی بھی قوم کا اصل سرمایہ ہوتے ہیں، کیونکہ نظام آخرکار انسانوں کے کردار پر چلتا ہے۔ اس کے برعکس فرائض سے غفلت کے نقصانات روز سامنے آتے ہیں: گندگی اور بے ترتیبی، قانون شکنی، بدعنوانی اور باہمی بے اعتمادی اسی غفلت کی پیداوار ہیں۔ تربیت کا درست طریقہ یہ ہے کہ بچوں کو حقوق کے ساتھ فرائض بھی سکھائے جائیں، مثلاً کھیل کے میدان کی صفائی، قطار میں کھڑے ہونا اور باری کا احترام۔ آخر میں یہ اصول سب کے لیے ہے کہ حقوق کی لمبی فہرست سے پہلے فرائض کی مختصر فہرست پر عمل کرنا ہی مہذب زندگی کی پہچان ہے۔

فرائض کا شعور کیسے پیدا ہو؟

فرائض کی ادائیگی کا مسئلہ محض معلومات کا نہیں، مزاج کا ہے۔ بہت سے لوگ اپنے فرائض جانتے ہیں مگر سستی، خود غرضی یا دوسروں کی دیکھا دیکھی سے انہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کا علاج تربیت کے تین ذرائع سے ہوتا ہے۔ پہلا ذریعہ گھر ہے، جہاں بچے کو چھوٹے فرائض مثلاً اپنی چیزیں سنبھالنا اور بزرگوں کا کام کرنا سکھایا جاتا ہے۔ دوسرا ذریعہ تعلیمی ادارہ ہے، جہاں اجتماعی کام، صفائی اور وقت کی پابندی فرائض کا عملی سبق بنتے ہیں۔ تیسرا ذریعہ معاشرتی پذیرائی ہے کہ فرض شناس استاد، دیانت دار تاجر اور خدمت گزار نوجوان کو عزت ملے، تاکہ نئی نسل کو معلوم ہو کہ معاشرہ کس کردار کی قدر کرتا ہے۔ جہاں یہ تینوں ذرائع کمزور پڑ جائیں، وہاں قانون اکیلا فرائض نہیں نبھوا سکتا۔

ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ فرائض کی بات کرتے ہوئے دوسروں کو مورد الزام ٹھہرانا آسان ہوتا ہے، مگر اخلاقیات کا تقاضا ہے کہ آغاز اپنے آپ سے ہو۔ ٹریفک کی خلاف ورزی پر تنقید کرنے والا خود سگنل کا احترام کرے، صفائی کا مطالبہ کرنے والا خود کچرا مقررہ جگہ پھینکے اور دیانت کا درس دینے والا اپنے کام میں دیانت دکھائے۔ یہی چھوٹی

وفاداریاں مل کر وہ فضا بناتی ہیں جس میں بڑے فرائض بھی ادا ہونے لگتے ہیں۔ اس لیے اس سوال کا عملی حاصل یہ جملہ ہے کہ فرض کا سب سے پہلا مخاطب خود انسان ہے، دوسرے اس کے بعد آتے ہیں۔

جدول :فرد کے فرائض کی اقسام

مثالیں	فرض کی قسم
صحت، تعلیم، کردار کی اصلاح	شخصی
والدین کی خدمت، اولاد کی تربیت	خاندانی
پڑوسی کا خیال، کمزور کی مدد	معاشرتی
قانون کی پابندی، ٹیکس، ووٹ کا درست استعمال	قومی

مندرجہ بالا جدول سے واضح ہوتا ہے کہ موضوع کے مختلف پہلو باہم جُڑے ہوئے ہیں اور کسی ایک پہلو کو نظر انداز کرنے سے مجموعی تصویر نامکمل رہ جاتی ہے۔ طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان پہلوؤں کو الگ الگ سمجھنے کے بعد ان کے باہمی تعلق پر بھی غور کرے، کیونکہ امتحانی جواب میں یہی جامعیت اچھے نمبروں کی بنیاد بنتی ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

مختصر یہ کہ فرد کے فرائض اس کی اپنی ذات، خاندان، معاشرے اور ریاست کے حوالے سے عائد ہونے والی ذمہ داریاں ہیں، جن میں قانونی اور اخلاقی دونوں قسمیں شامل ہیں۔ حقوق اور فرائض کا توازن ہی صحت مند معاشرے کی بنیاد ہے۔ جو فرد اپنے فرائض ادا کرتا ہے، وہی درحقیقت اپنے حقوق کا بھی سب سے اچھا محافظ ہوتا ہے۔

سوال نمبر9

سوال نمبر9 ۔ سیاسی تحفظ سے کیا مراد ہے؟ 10) نمبر(

مقدمہ

انسان کو صرف روٹی، کپڑے اور مکان کی نہیں بلکہ اس اطمینان کی بھی ضرورت ہے کہ اس کی رائے، اس کی تنظیم اور اس کی سیاسی سرگرمی کی وجہ سے اس کے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی۔ اسی اطمینان اور قانونی حفاظت کو سیاسی

تحفظ کہا جاتا ہے۔ اس سوال میں ہم سیاسی تحفظ کا مفہوم، اس کی صورتیں اور اس کی اہمیت بیان کریں گے، اور اس سوال کو پچھلے سوالات کے سیاسی حقوق سے جوڑیں گے۔

سیاسی تحفظ کا تصور ریاست اور شہری کے درمیان اعتماد کی علامت ہے۔ جس ریاست میں شہری اختلاف کے باوجود محفوظ ہو، وہاں سیاست پرامن رہتی ہے؛ اور جہاں یہ تحفظ ختم ہو جائے، وہاں سیاست خفیہ سازشوں اور تشدد میں بدل جاتی ہے۔

مفہوم

سیاسی تحفظ سے مراد یہ ہے کہ کسی شہری کو اس کے جائز سیاسی عقائد، رائے، جماعت سے وابستگی یا پرامن سیاسی سرگرمی کی وجہ سے گرفتاری، مظالم، ملازمت سے محرومی، کاروبار کی تباہی یا سماجی مقاطعے کا سامنا نہ کرنا پڑے، اور قانون اس کی جان، مال اور عزت کی حفاظت حکومت اور افراد دونوں کے مقابلے میں کرے۔ اس میں آزادانہ ووٹ دینے کا تحفظ بھی شامل ہے کہ ووٹر پر دباؤ نہ ڈالا جائے اور اس کا ووٹ خفیہ رہے۔ اسی طرح منتخب نمائندے کو ایوان میں بات کہنے کا تحفظ اور صحافی کو خبر دینے کا تحفظ بھی اسی وسیع تصور کی صورتیں ہیں۔ سیاسی تحفظ کا مطلب قانون سے بالاتر ہونا نہیں؛ جرم کرنے والے کو سیاست کی آڑ میں معافی نہیں ملتی، فرق صرف یہ ہے کہ گرفت عمل اور جرم کی بنیاد پر ہو، رائے اور اختلاف کی بنیاد پر نہیں۔

صورتیں اور ذرائع

سیاسی تحفظ کی حفاظت کے ذرائع میں آئین میں بنیادی حقوق کی ضمانت، آزاد عدلیہ جہاں شہری غیر قانونی گرفتاری کے خلاف درخواست دے سکے، شفاف انتخابی نظام، آزاد میڈیا اور انسانی حقوق کے ادارے شامل ہیں۔ عملی صورتوں میں سیاسی قیدیوں کے ساتھ قانونی سلوک، پرامن جلوسوں کو تحفظ دینا، ووٹر کی رازداری، اور مخالف جماعت کے دفتر و کارکنوں کی حفاظت قابل ذکر ہیں۔ بلدیاتی سطح پر بھی یہی اصول لاگو ہوتا ہے کہ گاؤں یا محلے میں سیاسی اختلاف کی وجہ سے کسی کا پانی، راستہ یا سماجی حقوق نہ روکے جائیں۔ یہ تحفظ جتنا اداروں سے ملتا ہے، اتنا ہی سماجی رواداری سے بھی ملتا ہے، کیونکہ جب معاشرہ اختلاف کو برداشت کرتا ہے تو تحفظ کو روز قانون کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اہمیت

سیاسی تحفظ کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے بغیر سیاسی حقوق کاغذی بن جاتے ہیں۔ ووٹ کا حق تب ہی سچا ہے جب ووٹر بے خوف ہو کر ووٹ دے سکے۔ اسی تحفظ سے اپوزیشن زندہ رہتی ہے اور حکومت کا احتساب ہوتا ہے، نئی قیادت سامنے آتی ہے اور پرامن انتقال اقتدار ممکن ہوتا ہے۔ معاشی سطح پر بھی سیاسی تحفظ ضروری ہے، کیونکہ جہاں تاجروں اور سرمایہ کاروں کو سیاسی انتقام کا خوف ہو، وہاں سرمایہ کاری رک جاتی ہے۔ نوجوانوں کی سیاسی دلچسپی بھی اسی تحفظ سے بڑھتی ہے؛ جب انہیں یقین ہو کہ پرامن سرگرمی سزا کا سبب نہیں بنے گی، تو وہ پرامن سیاسی عمل کا حصہ بنتے ہیں۔ اس کے برعکس جہاں یہ تحفظ نہ ہو، وہاں سیاست سے شریف لوگ دور ہو جاتے ہیں اور میدان خالی ہونے سے نظام مزید بگڑتا ہے۔

حدود اور ذمہ داریاں

سیاسی تحفظ مطلق نہیں ہوتا۔ تشدد، دہشت گردی، بغاوت کی عملی سازش اور ریاستی رازوں کی جاسوسی جیسے سنگین جرائم تحفظ کے دائرے سے باہر ہیں، کیونکہ یہ سیاسی رائے نہیں بلکہ جرائم ہیں۔ البتہ ان الزامات کا اطلاق بھی شفاف عدالتی عمل سے ہونا چاہیے تاکہ تحفظ کا خاتمہ بہانے سے نہ ہو۔ شہری کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ تحفظ کا غلط استعمال نہ کرے، یعنی سیاست کی آڑ میں جرم، فراڈ یا نفرت انگیزی نہ کرے۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ طاقت کے باوجود قانون کی حد میں رہے، اور اپوزیشن کی ذمہ داری ہے کہ وہ اختلاف کو ملک دشمنی میں نہ بدلے۔ اس دو طرفہ ذمہ داری سے ہی سیاسی تحفظ پائیدار بنتا ہے اور ملک میں سیاسی استحکام آتا ہے، جو ترقی کی پہلی شرط ہے۔

سیاسی تحفظ اور سماجی اعتماد

سیاسی تحفظ کا ایک پہلو سماجی بھی ہے، جس پر عموماً کم توجہ دی جاتی ہے۔ بعض اوقات قانون موجود ہوتا ہے، مگر محلے، خاندان اور برادری کا دباؤ شہری کو اس کے سیاسی انتخاب کی سزا دیتا ہے، مثلاً مخالف امیدوار کو ووٹ دینے پر سماجی مقاطعہ یا کاروباری نقصان۔ ایسی صورت میں تحفظ صرف عدالتوں سے مکمل نہیں ہوتا، سماجی رواداری اور برادری کے بزرگوں کے انصاف سے مکمل ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے ہمارے معاشرے میں پنچایت اور بزرگوں کے ذریعے ایسے تنازعات کو سلجھانے کی روایات بھی موجود ہیں، جنہیں انصاف کے ساتھ برقرار رکھنا تحفظ کا مقامی ذریعہ بن سکتا ہے۔

سیاسی تحفظ کا دوسرا جدید پہلو ڈیجیٹل زندگی سے جڑا ہے۔ سوشل میڈیا پر سیاسی رائے دینے والوں کو آن لائن ہراسانی، جعلی اکاؤنٹس سے کردار کشی اور ذاتی معلومات کے افشا کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اس کا حل بھی وہی اصول ہے جو عام زندگی میں ہے :اظہار ذمہ داری سے ہو اور جواب دلیل سے دیا جائے، ہراسانی اور دھمکی کسی صورت جائز نہیں۔ ریاست اور پلیٹ فارم دونوں کی ذمہ داری ہے کہ ایسی ہراسانی کی روک تھام کریں۔ اس اضافے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی تحفظ ایک زندہ تصور ہے جو ہر دور کے حالات کے مطابق اپنی صورتیں بدلتا رہتا ہے، البتہ اس کا اصول ہمیشہ ایک رہتا ہے کہ اختلاف کی سزا نہیں ملنی چاہیے۔

خلاصہ و نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ سیاسی تحفظ سے مراد شہری کو اس کی جائز سیاسی رائے و سرگرمی کی بنیاد پر انتقام اور زیادتی سے محفوظ رکھنا ہے۔ اس کے ذرائع آئین، عدلیہ، شفاف انتخابات اور ذمہ دار معاشرہ ہیں۔ یہ تحفظ سیاسی حقوق کو حقیقی بناتا ہے اور پرامن، مستحکم سیاست کی بنیاد رکھتا ہے، بشرطیکہ اس کا استعمال قانون کی حدود اور ذمہ داری کے ساتھ ہو۔

اس ضمن میں ایک عملی مثال ووٹ کے راز کی ہے۔ خفیہ رائے شماری کا نظام اس لیے بنایا گیا تھا کہ طاقتور امیدوار بھی ووٹر کی پسند کو نہ جان سکے اور نہ اس پر انتقام لے سکے۔ یہ ایک سادہ سا انتظام بتاتا ہے کہ تحفظ محض اعلان سے نہیں ہوتا، نظام کی چھوٹی چھوٹی تفصیلات سے بنتا ہے۔ اسی طرح آزاد عدلیہ کا تحریری فیصلہ، میڈیا کی جرات مندانہ خبر اور شہریوں کا ایک دوسرے کے حق میں آواز اٹھانا، یہ سب مل کر تحفظ کی وہ فضا بناتے ہیں جس میں سیاست بحث بنتی ہے، خوف نہیں بنتی۔ طالب علم کے لیے اس باب کا آخری نکتہ یہ ہے کہ تحفظ مانگنا کمزوری نہیں، نظام کی مضبوطی کی علامت ہے۔

سوال نمبر10

سوال نمبر10 ۔ معاشرتی تعلقات کی اہمیت پر نوٹ تحریر کریں۔ 10) نمبر(

مقدمہ

انسان کی خوشی اور غم کا بڑا حصہ اس کے تعلقات سے جُڑا ہوتا ہے۔ دولت اور آسائش کے باوجود اگر تعلقات کشیدہ ہوں تو زندگی بے رنگ ہو جاتی ہے، اور محدود وسائل کے باوجود اچھے تعلقات زندگی کو خوشگوار بنا دیتے ہیں۔ اس نوٹ میں ہم معاشرتی تعلقات کا مفہوم، ان کی اہمیت کے مختلف پہلو اور انہیں بہتر بنانے کے اصول بیان کریں گے۔

معاشرتی تعلقات سے مراد خاندان سے آگے بڑھ کر ہمسایوں، دوستوں، ساتھیوں، محلے داروں اور عام شہریوں کے ساتھ وہ روابط ہیں جو روزمرہ زندگی کو آسان، محفوظ اور خوشگوار بناتے ہیں۔ اخلاقیات کا بڑا حصہ درحقیقت انہی تعلقات کا آداب ہے۔

مفہوم اور دائرہ

معاشرتی تعلقات انسان کے اس سماجی جال کا نام ہے جس میں وہ جیتا ہے۔ اس میں سلام دعا اور خیریت دریافت کرنے سے لے کر کاروباری شراکت، محلے کی مشترکہ ذمہ داریاں اور قومی سطح کی وحدت تک سب شامل ہے۔ ان تعلقات کی بنیاد باہمی اعتماد، احترام اور تعاون پر ہوتی ہے۔ نفسیاتی تحقیق بھی بتاتی ہے کہ مضبوط سماجی تعلقات رکھنے والے لوگ نسبتاً زیادہ خوش اور صحت مند رہتے ہیں، جبکہ تنہائی اور کٹے ہوئے تعلقات ذہنی دباؤ بڑھاتے ہیں۔ مذہبی تعلیمات کے مفہوم میں بھی پڑوسی، مہمان اور عام مسلمان و انسان کے حقوق کو بار بار تاکید سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تعلقات کو دین و اخلاق میں مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ اس لیے معاشرتی تعلقات کو اضافی خوبی نہیں بلکہ زندگی کی بنیادی ضرورت سمجھنا چاہیے۔

عملی اہمیت

معاشرتی تعلقات کی عملی اہمیت روزمرہ زندگی میں نظر آتی ہے۔ بیماری اور ایمرجنسی میں سب سے پہلے ہمسایہ اور قریبی دوست کام آتے ہیں، سرکاری امداد بعد میں پہنچتی ہے۔ روزگار اور کاروبار کی بیشتر معلومات اور مواقع تعلقات ہی سے ملتے ہیں۔ خوشی کے مواقع تعلقات سے دوبالا ہوتے ہیں اور غم تعلقات کی ہمدردی سے ہلکا ہوتا ہے۔ محلے کی سطح پر اچھے تعلقات سے صفائی، حفاظت اور تنازعات کے حل جیسے اجتماعی مسائل آسان ہو جاتے ہیں۔ بڑے پیمانے پر قدرتی آفات میں قوم کا باہمی تعاون انہی تعلقات کا مظہر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جہاں تعلقات کمزور ہوں، وہاں معمولی تنازع تھانے کچہری تک جاتا ہے اور چھوٹے مسائل بڑے بحران بن جاتے ہیں، جس کی قیمت سب ادا کرتے ہیں۔

تعلقات کو بہتر بنانے کے اصول

معاشرتی تعلقات کو بہتر رکھنے کے اصول سادہ مگر محنت طلب ہیں۔ پہلا اصول سلام و خیر مقدم اور خوشی غمی میں شرکت ہے، جو تعلق کو زندہ رکھتا ہے۔ دوسرا اصول وعدے کی پابندی اور وقت کی قدر ہے، کیونکہ اعتماد وعدے سے بنتا ہے۔ تیسرا اصول غیبت اور چغلی سے پرہیز ہے، جو تعلقات کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ چوتھا اصول اختلاف میں بھی احترام ہے کہ بات دلیل سے ہو اور شخصیت پر حملہ نہ ہو۔ پانچواں اصول بے لوث خدمت اور احسان کو نہ جتانا ہے۔ چھٹا اصول عذر قبول کرنا اور معاف کرنا ہے، کیونکہ تعلقات کی عمر درگزر سے بڑھتی ہے۔ آج کے دور میں ان اصولوں میں ڈیجیٹل آداب بھی شامل ہو گئے ہیں کہ دوسروں کی تصاویر و باتیں اجازت کے بغیر آگے نہ بڑھائی جائیں اور آن لائن اختلاف بھی مہذب رکھا جائے۔

کمزور تعلقات کے نقصانات اور علاج

معاشرتی تعلقات کمزور ہونے کے نقصانات فرد سے لے کر قوم تک پھیلے ہوئے ہیں۔ فرد تنہائی، عدم تحفظ اور ذہنی دباؤ کا شکار ہوتا ہے۔ خاندان باہر کی دنیا میں بے سہارا محسوس کرتا ہے۔ محلہ اجنبیوں کا ہجوم بن جاتا ہے جہاں کوئی کسی کی خبر نہیں رکھتا۔ قومی سطح پر یہی کمزوری فرقہ، زبان اور علاقے کی تقسیم میں بدل سکتی ہے۔ اس کا علاج تعلقات میں سرمایہ کاری ہے :وقت دینا، سننا، مدد کرنا اور چھوٹی چھوٹی نیکیوں کو معمول بنانا۔ تعلیمی ادارے گروہی کام اور خدمت خلق کی سرگرمیوں سے طلبہ میں یہ صلاحیت پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ تعلقات یک طرفہ نہیں چلتے؛ دونوں جانب سے کوشش ہو تو ہی رشتہ بنتا ہے، اور جو شخص ہر تعلق میں صرف لینے کی سوچ رکھے، وہ جلد اکیلا رہ جاتا ہے۔

تعلقات اور جدید تنہائی

جدید دور کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ شہروں میں آبادی بڑھی ہے مگر تعلقات گھٹے ہیں۔ بڑی عمارتوں میں رہنے والے ایک دوسرے کو پہچانتے تک نہیں، اور موبائل کی دنیا نے سامنے بیٹھے انسان سے بات چیت کم کر دی ہے۔ ماہرین اس صورتحال کو سماجی تنہائی کہتے ہیں، جس کے اثرات ذہنی صحت پر تحقیق میں سامنے آ رہے ہیں۔ اس کا حل ٹیکنالوجی کو چھوڑنا نہیں بلکہ اس کا متوازن استعمال ہے؛ خاندان کے ساتھ مقررہ وقت، ہمسایوں سے باقاعدہ سلام

دعا، دوستوں سے ملاقات اور محلے کی اجتماعی سرگرمیاں اس تنہائی کو توڑتی ہیں۔ تعلقات میں سرمایہ کاری درحقیقت اپنی صحت اور خوشحالی میں سرمایہ کاری ہے۔

آخر میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ معاشرتی تعلقات صرف فائدے کے لیے نہیں بنائے جاتے۔ اگر تعلق صرف ضرورت کے وقت یاد آئے تو وہ تعلق نہیں سودا بن جاتا ہے۔ اصل تعلق وہ ہے جو بے لوث ہو :بغیر کسی کام کے حال پوچھنا، دوسرے کی خوشی میں دل سے شریک ہونا اور اس کی غلطی پر بھی اسے تنہا نہ چھوڑنا۔ ایسے تعلقات وقت کے ساتھ گہرے ہوتے جاتے ہیں اور بڑھاپے میں انسان کا اصل سرمایہ بنتے ہیں۔ اسی لیے بزرگ کہتے ہیں کہ دولت ختم ہو سکتی ہے مگر اچھے تعلقات زندگی بھر ساتھ دیتے ہیں، اور یہی اس نوٹ کا سب سے زندہ سبق ہے۔

خلاصہ و نتیجہ

مختصر یہ کہ معاشرتی تعلقات انسانی زندگی کی وہ بنیاد ہیں جن پر اعتماد، تعاون، خوشی اور امن قائم ہوتا ہے۔ ان کی حفاظت کے اصول سلام و شرکت، وعدے کی پابندی، غیبت سے پرہیز، اختلاف میں احترام اور بے لوث خدمت ہیں۔ مضبوط تعلقات فرد کو خوش، محلے کو پرامن اور قوم کو متحد رکھتے ہیں، اس لیے ان پر وقت اور توجہ صرف کرنا ہر باشعور انسان کی ذمہ داری ہے۔

یہ بھی یاد رکھا جائے کہ تعلقات کی مضبوطی کا ایک پیمانہ مشکل وقت ہوتا ہے۔ خوشحالی میں ہر محفل بھری ہوتی ہے، اصل ساتھی وہ ہے جو حادثے، بیماری اور مالی تنگی میں بھی قریب رہے۔ اسی لیے سمجھدار لوگ تعلقات کو خوش وقتوں میں ہی پانی دیتے رہتے ہیں، تاکہ ضرورت کے وقت وہ سایہ دار بنے ہوئے ملیں۔ اداروں کی سطح پر بھی یہی اصول چلتا ہے کہ جس ادارے کے ملازمین میں باہمی تعاون و احترام ہو، وہ بحران میں کارکردگی دکھاتا ہے، اور جہاں ہر شخص تنہا لڑ رہا ہو، وہاں معمولی جھٹکا بھی نظام کو گرا دیتا ہے۔ یوں تعلقات کی اہمیت فرد سے ادارے تک ایک ہی سچائی ہے۔